© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جس معاشرے میں آدمی خدمتِ دین کر رہا ہو، اُسے ہر پہلو سے اچھی طرح سمجھنا چاہیے۔ بیج ڈالنے والے کسان کو معلوم ہونا چاہیے کہ کھیتی کیسی ہے؟ اس کے زرخیز قطعات زیادہ ہیں یا بنجر؟ اور وہ کہاں کہاں ہیں؟

ہمارا موجودہ معاشرہ دولت پرست اور اسراف پسند معاشرہ ہے۔ ترقی کے نام سے معیارِ زندگی کو بڑھانے کی جو دوڑ دنیا بھر میں لگ رہی ہے، اس سے اہلِ پاکستان کا پہلے زیادہ تعلق نہ تھا۔ ۱۹۵۰ء کے بعد یہ رَو ہلکی ہلکی محدود دائروں میں شروع ہوئی، ۱۹۶۲ء کے بعد یہ قدرے تیز ہو گئی اور اس کا دائرہ بھی پھیل گیا۔ ۱۹۷۰ء کے بعد اس نے ایک طوفان کی شکل اختیار کر لی۔ پہلے تو یوں سوچا جاتا تھا کہ کون سے لوگ اس وبا میں مبتلا ہیں، اب دل دردمند رکھنے والے عناصر یہ جاننا چاہتے ہیں کہ کون سے لوگ اس سے محفوظ ہیں، —— پورے محفوظ نہ سہی، واجبی حد تک!

مگر اب یہ طوفان کُو بہ کُو اور گھر بہ گھر دندنا رہا ہے۔ ہر سطح کے گھروں اور افراد کے سامنے قطعۂ زمین، مکان یا کوٹھی، اسکوٹر یا کار، ٹیلی وژن اور فرج، ایئر کنڈیشنر اور کپڑے دھونے کی مشین، قالین اور فرنیچر، جدید چولہے اور ہیٹر، گدے دار پلنگ اور دروازوں کھڑکیوں کے پردوں کی بے حساب خواہشات کی لمبی فہرست ہے اور وہ ان میں سے باری باری ایک ایک چیز کے حصول کو منزل بنا کر دوڑ لگا رہا ہے۔ اس دَور میں ہانپتے ہوئے وہ دینی عبادات و شعائر،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خاندانی روایات، مہذبانہ اقدار، درخشاں اخلاقیات کے بھاری خزانوں کو اس لیے پھینک رہا ہے کہ یہ دوڑ میں حائل ہوتے ہیں۔ وہ حلال وحرام اور جائز و ناجائز کی تمیز سے بے نیاز ہو کر ہر قیمت پہ روپیہ کو حاصل کرنا اور آمدنی کو بڑھانا چاہتا ہے۔ رشوت ہو کر اسمگلنگ، ملاوٹ ہو کر بھاری منافع اور گراں فروشی، قومی املاک میں خیانت ہو یا عام امانات میں خورد برد ——— اور ان چیزوں سے آگے بڑھ کر چوری، لوٹ مار، جیب تراشی، سڑکوں پر بسیں روک کر ڈاکہ زنی، شرکاروں کے لیے بچوں کا اور جنسی گندگی پھیلانے والوں کے لیے عورتوں کا اغوا، اور سب سے بڑھ کر قتل ——— یہ سارے جرائم لوگوں کو پسند آرہے ہیں۔ دیدہ دلیری کی حد یہ ہے کہ نہ صرف سرکاری کاغذات کے اندراجات سے بے پروا ہو کر پلاٹوں اور عمارتوں پہ قبضے جمائے جاتے ہیں، دکانوں اور مکانوں کو کرایہ پہ دینے کے لیے ہزاروں روپے کی پگڑیاں وصول کی جاتی ہیں بلکہ صدہا واقعات ایسے ہیں کہ ایک شخص کسی دوسرے کی زمین کو اسی کے نام فروخت کرتا ہے اور خود عدالت میں جا کر رجسٹری کراتا ہے اور اسے گراں بہا رقم مفت میں ہاتھ آجاتی ہے۔ بچے امتحانات کے کمروں میں نگرانوں کی آنکھوں کے نیچے نقل کرتے ہیں، کتابیں اور نوٹس یکے بعد دیگرے منتقل ہوتے ہیں اور جرم وخیانت کی قوت اتنی زبردست ہے کہ کوئی دم نہیں مار سکتا۔ رہی سہی کسر طلبہ کے والدین اور سرپرست اپنے محبتوں اور دوستوں کی مدد سے پوری کرتے ہیں۔ وہ پرچوں کا باقاعدہ تعاقب کرتے ہیں اور نمبر لگانے والے ممتحنوں کو سفارش یا رشوت یا دھمکی کے بل پر مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اُن کے فیل ہونے والے بچے کو فسٹ کلاس کے پاس نمبر دیں۔ اس سطح پر کام نہ بنے تو پھر اگلی منزل ہیڈ ایگزامینر ہوتے ہیں۔ وہاں کوئی مشکل ہو تو نتیجہ مرتب کرنے والے عملے سے گٹھ جوڑ کر لیا جاتا ہے۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو جعلی ڈگریوں اور ڈپلوموں کا دروازہ اسی طرح کھلا ہے جیسے جعلی پاسپورٹوں اور ویزوں اور سرٹیفکیٹوں کا۔

پھر ایک بلا یہ نازل ہوئی ہے کہ کچھ تو کاریگروں اور مزدوروں کی کمی کی وجہ سے اور کچھ یہ دیکھ کر کہ اُن کے بھائی بند چند سو میل کی دوری پر اُن سے چار گنا کمائی کر رہے ہیں انہوں نے اپنے نرخوں اور اجرتوں میں بھاری اضافے کر دیے ہیں۔ ایک پلمبر پندرہ منٹ میں اور ایک بجلی کا اناڑی مستری ایک گھنٹے میں اتنا کما لیتا ہے جتنا تعلیم یافتہ لوگ دو تین گھنٹوں میں، لیکن ستم یہ کہ کام چوری

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور کام میں نالائقی اور خیانت کاری مزید بڑھ گئی ہے۔ کارخانوں میں مزدور اور دفتروں میں بابو نہ پوری حاضری دیتے ہیں، نہ پورا اور معیاری کام کرتے ہیں مگر تنخواہوں اور اجرتوں کے اضافے کے لیے سر راہ تیار۔ درحقیقت یہ ایک بہت ہی وسیع سلسلۂ خیانت ہے۔

خدا کے کچھ نیک دل اور شریف بندے اگر اچھے اصول و اخلاق کے تحت ان مفاسد سے پرہیز کر کے نقصان اُٹھاتے ہیں تو سارا معاشرہ اب انہیں اگلے وقتوں کے بیوقوف سمجھتا ہے حتیٰ کہ خود اُن کے بیوی بچے بھی ایک نہ ایک دن انہیں اپنی اس رائے سے آگاہ کر دیتے ہیں کہ تم نے اپنے خیالی اصولوں اور بے فیض اخلاقیات کی وجہ سے ہم سب کو پسماندگی میں جھونک دیا ہے۔ وہ چند گھرانے بڑے عظیم ہوں گے جن کی خواتین اور بچے گھروں کے سربراہوں کے ایمان و اخلاق پر "ترقی" میں حائل ہونے کے باوجود راضی ہوں۔ معاشرے کی اصل دینی قوت ایسے ہی گھرانوں میں جڑیں رکھتی ہیں۔

اس آگ کو "دوبئی ازم" نے اور بھڑکا دیا ہے۔

دوبئی ازم سے میری مراد کوئی خاص ملک نہیں ہے، بلکہ وہ دوبئی ہو یا سعودی عرب، ناروے اور بلجیم ہوں یا برطانیہ اور امریکہ "دولت پرستوں" کے لیے یکساں متبرک مقامات ہیں۔ یہاں سے وہاں تک ایک دوڑ لگ رہی ہے۔ گاؤں یا محلے کا ایک شخص جاتا ہے اور کچھ دنوں بعد جب روپیہ اس کے گھر میں ناچنے لگتا ہے تو اڑوس پڑوس میں مائیں اپنے بیٹوں کو اور بیویاں اپنے شوہروں کو باہر جانے کی اس طرح تلقین کرنے لگتی ہیں جیسے سچے مسلم معاشرے کی مائیں جہاد اور ہجرت اور حج کی تلقین کیا کرتی تھیں۔ بچہ ماں کی گود میں ہوتا ہے تو وہ اس کے کانوں میں ڈالنے لگتی ہے کہ تم بڑے ہو کر باہر جاؤ گے اور سارے گھر کو دولت سے بھر دو گے۔ بعید نہیں کہ اب ایسی لوریاں رواج پا جائیں جن میں معصوم جانوں کی لوح سادہ پر یہ نقش خوب گہرا کر دیا جائے کہ زندگی کا سب سے بڑا مقصد دولت کمانا ہے اور دولت کمانے کے لیے دوبئی اور ابوظہبی، یا برطانیہ و امریکہ جانا واجب ہے۔

دنیا کی ضروریات پوری کرنے کے لیے روپیہ کمانا، یا معاشی تگ و دَو کے لیے ملک سے باہر جانا ممنوع نہیں ہے۔ اصل مصیبت یہ ہے کہ جانے والے ایک تو مغربی کلچر کے قالب سے گزر کر آتے ہیں اور بیرونی سامانوں کے ساتھ وہاں کے آداب و شعائر بھی ساتھ لے آتے ہیں۔ دوسری یہ کہ وہ اپنے معاشرے کی سطح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کئی گنا زیادہ کمائی کرنے کی وجہ سے باہر کی مسرفانہ زندگیاں گزار کے آتے ہیں تو یہاں بھی ان کا ذہن اور ان کا وافر روپیہ اُن کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے معاشرے کے سامنے خوب خراچ بن کر دکھائیں اور فخر کریں۔ بلکہ جو بے صلاحیت لوگ باہر جھاڑو دے کر کام چلاتے ہیں، اور کھانے لباس اور رہائش میں انتہائی کنجوسی کر کے گھٹیا زندگی بسر کرتے ہیں۔ وہ بھی واپس آکر اپنے ماحول میں بڑے ٹھاٹھ باٹھ دکھلاتے ہیں، جیسے کہ جناب سونے کی کان سے مال نکال لائے ہیں۔ ان کے سامنے آنے والے گھر سجنے والے سامان، مشینیں اور الیکٹرانکس اُن کے اپنے اور بیگمات اور بچوں کے نظر فریب ملبوسات اور دکانوں پر اُن کی نوابانہ خریداری کثیر تعداد کو مبہوت کر دیتی ہے۔ قسائی کے ہاں گئے تو دو سیر گوشت کا آرڈر دے دیا۔ پھل والے کے ہاں پہنچے تو پانچ منٹ میں سو روپے کا پھل اٹھوا لیا۔ زمین کا پلاٹ خریدنے نکلے تو بھاری سے بھاری قیمت بآسانی ادا کرنے کو تیار۔ تعمیر شروع کرائی تو لاکھوں کے وارے نیارے ہوگئے، کوئی تقریب گھر میں ہوئی تو گویا عباسی دور کے دربار شاہی کا کوئی جشن منعقد ہوگیا۔ ضروریاتِ زندگی کے تیزی سے مہنگا ہونے کی وجہ نہ صرف افراطِ زر ہے بلکہ زیادہ موثر وہ مسرفانہ رویہ ہے جو دوبئی اور امریکہ سے آنے والا روپیہ پیدا کرتا ہے۔ ان حضرات کے اعزاز کے لیے ہوائی اڈوں پر ٹیکسیوں کے کرایے تگنے چوگنے ہوگئے ہیں اور ملک کے مقامی لوگوں کو بھی یہ نیا بوجھ اُٹھانا پڑا۔ یہ بوجھ ایک ہی مد میں نہیں، ہر مد میں اسی طرح باہر جانے والوں پر لد گیا ہے۔

ایسے مضحکہ انگیز واقعات میرے سامنے ہیں کہ کسی گھر میں ٹیلی ویژن لگا ہے اور اس کے لیے بجلی جنریٹر سے پیدا کی جاتی ہے۔

ایک شخص ان پڑھ بھائی یا بیٹے کے لیے گھڑی بھیجتا ہے اور وہ اس قابل نہیں کہ بیٹری والی نئی گھڑی کے ڈائل کو اچھی طرح پڑھ سکے۔ گڈریا بکریاں چرا رہا ہے اور چار بینڈ کا ریڈیو کیکر کی جھاڑیوں میں رکھ کر ایسے نغمے سن رہا ہے جن کو وہ سمجھ نہیں سکتا۔ بوڑھی نانیوں اور دادیوں کی کلائیوں پر گھڑیاں بندھی ہیں۔

کیا یہ دولت جیسی نعمتِ خداوندی کے ساتھ مذاق نہیں ہے۔

وجہ خرابی یہ بھی تو ہے کہ کم تعلیم یافتہ (بلکہ ان پڑھ) اور کم صلاحیت کے لوگ چار چار سال میں دس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مالی سطح پر جا پہنچے جہاں یہاں کے قابل حضرات مدتوں میں نہ پہنچ سکے۔ اس لحاظ سے یہ ایک نئی قسم کے نو دولتیوں کی کلاس ہے۔ اور اس نے نئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ اس نے دولت پرستی اور اسراف پسندی کی وبا کو حد سے زیادہ بڑھا دیا ہے۔ یہ کلاس ہوائی جہازوں میں سفر کرتی ہے اور بیشتر سیٹیں اسی کے پاس ہوتی ہیں۔ یہ لوگ اپنے بچوں کو یہاں لائیں تو کنڈر گارٹن اور انگلش میڈیم سکولوں اور کالجوں میں داخل کر لیتے ہیں۔ ان کی خواتین تک یہاں کی عورتوں پر گرفت کرتی ہیں کہ "باہر کا کپڑا" تو ہے نہیں ------------، کم درجے کے لوگ جب بھی گھر آتے ہیں تو ہر دفعہ ٹیپ ریکارڈر، ریڈیو گرام، ہنڈ موس، کیمرے وغیرہ ساتھ لاتے ہیں۔ کوئی چیز پاس رکھی، کسی کو بیچ کر خاصی کمائی یہاں کر لی۔ بڑے لوگ کاریں، فریج، ٹیلی وژن، ٹرک، ٹریکٹر، منی بسیں، بڑی بسیں، کپڑے دھونے کی مشینیں ساتھ لاتے ہیں اور اپنی دولت کی قوت سے یہاں کے پرانے کاروباریوں کے مقابلے میں میدان میں آجاتے ہیں۔ ذرا سوچیے کہ کتنا زرمبادلہ ہر سال پاکستان کے بجائے دوسروں کی جیب میں جاتا ہے۔ یہی اگر ہمارے پاس رہے تو ذرائع یا صنعت و زراعت میں کتنی تیزی سے ترقی ہو سکتی ہے۔ انڈیا کے لوگ بھی ہم سے زیادہ ہی باہر کمائی کرتے ہیں مگر حکومت کی طرف سے اجازت نہیں کہ وہ ہر بار جدید قیمتی سامانوں سے لدے پھندے ملک میں داخل ہوں۔

میں معذرت کرتا ہوں کہ جس طرح ملک کے اندر کے لوگ میرے بھائی ہیں، اسی طرح مجھے باہر جا کر معاشی تگ و دو کرنے والے بھی عزیز ہیں۔ میں دونوں کا احترام کرتا ہوں۔ مگر ایک خاص صورتِ حال کی وجہ سے جو مسائل پیدا ہو رہے ہیں اُن پر بحث کیے بغیر ہم اپنی فلاح و بہبود پر غور ہی نہیں کر سکتے بخصوصاً دین کی خدمت کرنے والے لوگ اپنا فریضہ صحیح طور پر انجام نہیں دے سکتے۔

ہمارے موجودہ دولت پرستانہ ماحول میں یہ حقیقت کسی کو یاد ہی نہیں کہ دولت اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور جسے کمانے اور خرچ کرنے کا یہ اصول نہیں کہ جیسے جی چاہے ----۔ اس حقیقت کے نظروں سے اوجھل ہو جانے کی وجہ سے اسراف پسندانہ رجحانات زور پکڑ گئے ہیں۔

لباسوں خصوصاً خواتین کی ساڑھیوں اور غراروں، بیل باٹم اور دوسرے ملبوسات کا اسراف یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ کسی زنانہ ادارے میں چلے جایئے تو معلوم ہوگا کہ فاخرہ لباسوں کا کوئی مقابلہ ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہا ہے۔ راہ چلتی خواتین کی بیشتر تعداد کو دیکھ کر بھی یہی گمان گزرے گا کہ کسی مینا بازار کو جا رہی ہیں۔ پھر فیشنوں کا برسات کے موسم کی طرح نت نئے رنگ بدلنا، پھر آرائش کے سامانوں کا استعمال اور خضاب اور مصنوعی چوٹیوں اور سو سو روپے تک کی فیس دے کر بال ترشوانا اور آرائشِ گیسو کرانا ـــ ان چیزوں کی مدد سے ۵۰ برس میں ۲۵ برس کی عمر کا سماں پیدا کر لیا جاتا ہے۔ دھیان اُدھر ہے ہی نہیں کہ سامنے ایک قبر تیار ہو رہی ہے اور موت اس کے دروازے سے جب عالمِ آخرت میں لے کے جائے گی تو اُسے نہ عمر کے بارے میں کوئی مغالطہ ہو گا، نہ صحت کے متعلق ـــ سامانِ آرائش ـــ پوڈر، کریمیں لپ اسٹکس، فحش قسم کی انگیائیں دبر بسٹرز، ابرو منڈوا کر .... اپنے پسندیدہ رنگ سے حسبِ منشا طوالت اور خم رکھنے والے ابرو بنانے کی پنسلیں۔ موڈیسٹی تولیے، ازالۂ موئے نامطلوب کی کریم اور لوشن، رنگ کو گورا کرنے کے لیے ضمادیات، بالوں کے شیمپو وغیرہ کا کاروبار زوروں پر ہے ـــ ان آرائشی اور فیشنی چیزوں کی ایک دکان پر چند سال پہلے میں نے ایک دوست سے پوچھا کہ بھئی ساری دکان ان چیزوں سے بھر دی ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ان کی یومیہ بکری اتنی ہے کہ ہمارا کام خوب چلتا ہے۔ اور قیمتیں اتنی بھاری ہیں کہ خاصا منافع ملتا ہے۔

یہ سارا بوجھ خاوندوں یا باپوں اور بھائیوں کی آمدنیوں پر پڑتا ہے اور وہ بیچارے جب رزقِ حلال سے اُسے پورا نہیں کر سکتے تو حرام کے راستوں سے حاصل کرتے ہیں۔

کپڑا خاص طور سے، اور دیگر اشیاء عام طور پر باہر کی خریدنا اور مہنگی قیمتیں ادا کرنا ایک عام وتیرہ ہے۔ باہر کے سامانوں کی بازاری منڈیاں ایسے لوگوں کی پیاس بجھانے کو موجود ہیں جن کا اپنا کوئی آدمی باہر ملازمت کر کے ضروریات ولا ضروریات کی فراہمی کرنے والا نہ ہو۔ ان منڈیوں میں بھی، اور مشرقِ وسطیٰ کے ممالک میں بھی بسا اوقات پاکستان ہی کا بنا ہوا نفیس کپڑا اور دوسرا سامان جاپان اور امریکہ کی مہروں کے ساتھ فروخت ہوتا ہے اور غیر پاکستانی مصنوعات کے فدائی ایسی اشیاء کو بڑی ذہنی تسکین کے ساتھ خریدتے ہیں۔

کسی گھر میں چلے جائیے، صوفہ سیٹ سے کم درجے کا فرنیچر تو مشکل ہی سے کہیں ملے گا۔ کچی بستیوں.. تک میں ایسی چیزیں آپ دیکھیں گے کہ آپ کو پکے مکان میں حاصل نہیں۔ میں نہایت گندے گھروں کے بچوں کو جب تیز شوخ رنگوں اور غیر ملکی ڈیزائنوں کے کپڑے بھدے طریق سے پہنے ہوئے دیکھتا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں تو یوں لگتا ہے جیسے کسی نے انہیں خیرات میں دیتے ہوں - کہیں المونیم کے ڈھیر اور چولہے اور مٹی کے ٹوٹے ہوئے برتنوں کے پاس ولایتی مختصر موس پڑا ملے گا - اب یہاں کے نوجوانوں میں "جینز" پہننے کا رواج ہو چلا ہے - نیز ہمارے کارخانوں میں یہ کپڑا بننے لگا ہے - اس میں کوئی خوبی نہیں - صرف اسے پہننے سے یہ لذتِ فخر حاصل ہوتی ہے کہ تہذیب بدن پرست کے اُستادوں میں اس کا رواج ہو گیا ہے - پتلون پہننے والی خواتین بھی دیکھنے میں آئیں گی - واہ ری ترقی !

اگر صحیح معنوں میں آپ کو رفتارِ اسراف کا اندازہ کرنا ہو تو ایک تو اعلیٰ قسم کے سامانوں کی دکانوں اور سٹوروں پر بیٹھ کر اس قوم کا تماشا دیکھیے جیسے اقبال نے پکار کر کہا تھا کہ :-

ع "تو کجا بہر تماشا می روی" - دوسرے کسی شادی یا سالگرہ کی تقریب میں شامل ہو کر اندازہ کیجیے کہ ہماری اقتصادی پسماندگی کا راز کیا ہے -

پچاس پچاس جوڑے کپڑوں کے ـــــ اِدھر سے بھی اُدھر سے بھی ـــــ جن میں زیادہ تر "باہر کے" ہوں گے - ورنہ ناک کٹ سکتی ہے - جہازی سائز کے سنہرے اور قوس قزحی رنگوں میں چھپے ہوئے نقشیں عید کارڈ جن کے نیچے "بیگم فلاں" کا نام شانِ اوّلیت کے ساتھ لکھا ہوتا ہے ، دس دس بارہ بارہ تولے سونے کا زیور - سو سو آدمیوں کی باراتیں ، آٹھ آٹھ سو افراد کے ولیمے ، مہمانوں کے لیے چار چار قسم کے شاہانہ کھانے اور پھر پھلوں کے ڈھیر ، جن کا خاصا بڑا حصہ ضائع جاتا ہے ، کوکا کولا کی ایک ایک ہزار بوتلوں کا صفایا - عظیم الشان مہر (جن کے ادا کرنے کی نوبت کم ہوتی ہے) لڑکی والوں سے بھاری جہیز کا مطالبہ - مطلوبہ اشیاء (فرج ، ٹیلی وژن ، سکوٹر وغیرہ) کی فہرست سامنے رکھ دینا - بلکہ یہ بھی چاہنا کہ باہر جا کر لڑکے کے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے اخراجات بھی دلہن والے ادا کریں ، کیونکہ اُن کا تصور یہ ہے کہ وہ لڑکی والے ہیں - پھر ملنے کے ہار ، اور اُن کے ساتھ نوٹوں کے ہار ، شامیانے اور سیکڑوں بلبوں کی روشنیاں - دولت کا دریا بہہ رہا ہوتا ہے - لیکن دوسری طرف یہ بدتوفیقی - کہ ہزاروں روپے پھونکنے والے گھر میں مہمانوں کو بٹھا کر کھانا کھلانے کا انتظام نہیں - جگہ اور خرچ کے بہانے تو بوجہی ہوتے ہیں - اصل یہ ہے کہ "کلچرل فادر" کی پسند و ناپسند کا لحاظ ہوتا ہے -

پھر شادی یا تقریب والے گھر میں عورتوں کے لباس و آرائش کا مینا بازار لگ جاتا ہے - پردے کے پرخچے اُڑ جاتے ہیں - کوئی سچے پردے والی اور نماز پڑھنے والی خاتون (باقی بر صفحہ ۳۹)

© rasailojaraid.com